باب سوم

شروعات، وقفے، قیاسات

اردو ادب کے باقاعدہ آغاز کا سہرا مسعود سعد سلمان لاہوری (۱۰۴۶ تا ۱۱۲۱) کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس "ہندی" دیوان کا اب کوئی سراغ نہیں ملتا جو مسعود سعد سلمان نے ترتیب دیا تھا۔ اس دیوان کے بارے میں ہمارا قدیم ترین مآخذ محمد عوفی کا تذکرہ "لباب الالباب" ہے جس کی تاریخ تصنیف ۱۲۲۰ تا ۱۲۲۷ متعین کی گئی ہے، یعنی مسعود سعد سلمان کے ٹھیک سو سال بعد۔ محمد عوفی نے یہ تذکرہ سندھ میں لکھا، اور اسے فارسی زبان کا پہلا تذکرہ کہا جاتا ہے۔ عوفی نے لکھا:

> اگرچہ اس کی پیدائش ہمدان کی تھی، لیکن چونکہ اس کے کلام کی کثرت علم و فن بلاد مشرق میں پھلی پھولی اور برگ و بار لائی... اور اسے ہمیشہ انھیں علاقوں کا شاعر مانا گیا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ اس جگہ درج ہوتا ہے... اس کے کلام کی مقدار اور سب شعرا سے زیادہ ہے۔ اس کے تین دیوان ہیں: ایک عربی، دوسرا فارسی، اور تیسرا ہندی۔ اور جو کچھ اس کے کلام سے دیکھا گیا، استادانہ اور دل خوش کن تھا۔(۱)

چونکہ ہندوستانی قرون وسطیٰ میں لفظ "ہندی"، کبھی کبھی یوں بھی استعمال ہوا ہے کہ اس سے کوئی بھی

---

(۱) محمد عوفی: "لباب الالباب"، مرتبہ ای۔ جی۔ براؤن اور مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی، تہران، ۱۳۳۳ شمسی (= ۱۹۵۴)، ص ۴۲۳۔ مزید ملاحظہ ہو، براؤن ہی کا مرتب کردہ لائڈن/لندن ایڈیشن، حصۂ اول، ۱۹۰۳، ص ص ۲۶۴ تا ۲۵۲۔

زبان مراد لے لی گئی ہے (البیرونی نے اسے بہ معنی "سنسکرت" لکھا ہے)، اس لیے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ مسعود سعد سلمان کے "ہندی" دیوان کی اصل زبان تھی کیا، اور آیا یہ پنجابی ہو سکتی ہے۔

محمد عوفی پر سات ہی آٹھ دہائیاں گذری تھیں جب امیر خسرو نے اپنی معرکہ آرا مثنوی "نہ سپہر" لکھی (۱۳۱۷/۱۳۱۸)۔ اس میں انھوں نے ان زبانوں کا ذکر کیا ہے جو عرصۂ دراز سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آزاد زبان کی حیثیت سے اس وقت افزائش پذیر تھیں۔ ان میں خسرو نے "لاہوری" (= پنجابی) کا بھی ذکر کیا ہے۔ اغلب ہے کہ اگر مسعود سعد سلمان کا دیوان پنجابی میں ہوتا تو محمد عوفی بھی اس کی زبان "لاہوری"، نہ کہ "ہندی" بتاتا۔ خسرو نے اپنی مثنوی کے اس باب کے عنوان میں کہا کہ "گفت ہند" اپنے "الفاظ خوش گوار" کے باعث "پارسی و ترکی" پر "راجح" ہے۔ پھر انھوں نے لکھا:

الغرض از پارسی و ترک و عرب
بیہدہ باشد کہ کنم دل بہ طرب
من چو ز ہندم بود آں بہ کہ کسے
از محل خویش بر آرد نفسے
ہست دریں عرصہ بہر ناحیتے
مصطلحے خاصہ نہ از عاریتے
سندی و لاہوری و کشمیر و کبر
دھور سمدری و تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اود
دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
ایں ہمہ ہندیست کہ زایام کہن
عامہ بکاراست بہر گونہ سخن (۲)

(ترجمہ)

الغرض، یہ بات بالکل فضول ہے کہ میں اپنا دل فارسی، ترکی اور عربی کے نغموں

(۲) امیر مبین الدین خسرو، "نہ سپہر"، مرتبہ ڈاکٹر وحید مرزا، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، برائے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن، کلکتہ، ۱۹۴۸، ص ص ۱۷۹ تا ۱۸۰۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

پر مائل کروں،
اور اسے اس طرح خوش کروں۔
میں چونکہ ہندوستانی ہوں، اس لیے یہی بہتر ہے کہ میں اپنے ہی مقام سے گفتگو کروں۔

علما کو یہ طے کرنے میں بہت دقت ہوئی ہے کہ خسرو کی نام بردہ زبانوں کے جدید نام کیا ہیں۔ ڈاکٹر وحید مرزا، جن کے مدون کردہ متن سے میں نے اشعار لکھے ہیں، انھوں نے ان الفاظ کے جدید معنی نہیں لکھے۔ علاوہ بریں، اس مثنوی کے جتنے نسخے میں نے دیکھے ہیں، اغلاط سے خالی نہیں۔ خود وحید مرزا کا بھی متن پوری طرح مطمئن نہیں کرتا اور مجھے کہیں کہیں تصحیح کرنی پڑی ہے۔

گریرسن نے *Linguistic Survey of India*، جلد اول، حصہ اول، ص ا، پر الیٹ کے ترجمے پر اعتبار کرتے ہوئے حسب ذیل نام بیان کیے ہیں: سندھی = سندھی؛ لاہوری = پنجابی؛ کشمیری = ڈوگری؛ دھو سمندری = میسوری کنڑ؛ تلنگی = تیلیگو؛ گجر = گجراتی؛ معبری = ساحل کارومنڈل کی تامل؛ گوری = شمالی بنگالی؛ بنگال اود = مشرقی ہندی؛ دہلی اور اس کا قرب وجوار = مغربی ہندی۔

اس فہرست میں کئی مشکلیں ہیں۔ اول یہ کہ کشمیری کو ڈوگری کیوں بتایا گیا؟ دوم، "کبر" کے معنی نہیں بتائے گئے۔ سوم، اگر "گوری" کوئی زبان ہے (بقول گریرسن شمالی بنگالی)، تو خود گریرسن نے ہندوستانی زبانوں کی اپنی وسیع و عریض فہرست میں (جو اسی جلد میں شامل ہے) اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟ چہارم، "بنگال اود (ھ)" نام کی کوئی زبان نہیں ہے، اور "مشرقی ہندی" بھی انگریزوں کا وضع کیا ہوا مشکوک نام ہے۔ پنجم، بنگال اور اودھ کو یک جا کرنے کا کوئی جواز نہیں، اور نہ ہی بنگالی کو "مشرقی ہندی" کہہ سکتے ہیں (اگر مشرقی ہندی نام کی کوئی چیز واقعی ہو بھی)۔

میں ان ناموں کو جہاں تک سمجھا ہوں، اسے ذیل میں درج کرتا ہوں:

سندھی = سندھی؛ لاہوری = پنجابی؛ کشمیر = کشمیری؛ کبر = ؟ دھور سمندری = یہ غالباً "دوار سمدری" ہے۔ پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی نے مجھے بتایا کہ "دوار سمدر" اس زمانے میں ایک حکومت تھی۔ یہ آج کے کرناٹک کو محیط تھی اور اس کا دارالخلافہ جدید کرناٹک کا شہر ہاسن تھا۔ لہٰذا دھور سمندری سے مراد کنڑ ہے۔ تلنگی = تیلیگو؛ گجر = گجراتی؛ معبری = تامل، کیوں کہ جدید تامل ناڈ کے جنوبی ترین نقطے سے عرب جہاز راں سراندیپ کے لیے روانہ ہوتے تھے (معبر = عبور کرنے کی جگہ)۔ گوری = مراٹھی؟ / گوڑ (جو آج مغربی بنگال کے ضلع مالدہ کا حصہ ہے) کی بنگالی؟ اگر ایسی کوئی زبان تھی، تو وہ بنگالی سے مختلف ہو گی، کیوں کہ خسرو نے بنگالی کو الگ سے درج کیا ہے۔ لیکن مجھے ایک شک یہ ہے کہ "گوڑی / گوری" دراصل مراٹھی کی کوئی شکل رہی ہو گی۔

عابد پیشاوری نے "قاموس الاغلاط" کے مصنفوں کا ایک قول نقل کیا ہے کہ مراٹھی "گوٹھ زبانوں میں سے ہے۔" (عابد پیشاوری، "گاہے گاہے باز خواں"، نئی دہلی، سیمانت پرکاشن، ۱۹۹۴، ص ۱۴)۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، جو خود اعلیٰ درجے کے ماہر لسانیات ہیں، اپنی کتاب "امیر خسرو کا ہندوی کلام" (شکاگو، ۱۹۸۷، ص ۲۹) پر "کبر" کو ڈوگری، "دھور سمندری" کو تامل، "معبری" کو کنڑ، اور "گوری" کو آسامی بتاتے ہیں۔ تامل اور کنڑ کے ناموں کو الٹ دینا شاید غیر شعوری سہو ہو گا، لیکن "گوری" کو آسامی بتانے کی وجہ انھوں نے نہیں بیان کی، نہ ہی "کبر" کو ڈوگری قرار دینے کے بارے میں انھوں نے کچھ گفتگو کی ہے۔ وہ اس بات کی بھی وضاحت نہیں کرتے کہ آسام کی زبان کا نام بنگال کے ایک ضلعے گوڑ کے نام پر کیوں رکھا گیا ہو گا۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

اس مملکت کے ہر نواح میں ان کی اپنی مخصوص زبانیں ہیں، اور وہ عاریت کی بھی نہیں، بلکہ وہیں کی ہیں۔

سندھی، لاہوری، کشمیری، کبر، دھور سمندری، تلنگی، اور گجر۔

معبری، اور گوری، اور بنگال، اور اودھ۔

اسی طرح، دہلی اور اس کے قرب وجوار کی زبان بھی اپنی سرحد کے اندر ہے۔

یہ سب ہندوی زبانیں ہیں، کہ ایام کہن سے عام طور پر ہر طرح کی بات چیت اور کلام کے لیے مستعمل ہیں۔

ان اشعار سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ لاہوری (= پنجابی)، دوسری زبانوں مثلاً سندھی، اودھی، سے الگ ایک زبان ہے، اور وہ دہلی اور اس کے گرد و پیش کی "مصطلح" (مخصوص زبان) سے بھی الگ ہے۔ "نہ سپہر" کے کوئی پچیس سال پہلے امیر خسرو نے اپنے دیوان "غرۃ الکمال" (۱۲۹۴) کے دیباچے میں لکھا:

ترک ہندستانیم من ہندوی گویم جواب شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است۔ اینجا بہ ذکرے بس کردہ

گیان چند ("تاریخ"، جلد اول، صفحہ ۲۳) نے "مشرقی ہندی (Eastern Hindi) کی قواعد پر روڈولف اے ایف ہرنل (Rudolf A.F. Hoernle) کی ایک عالمانہ کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۰ میں شائع ہوئی، اور ہرنل نے اس کا نام حسب ذیل رکھا تھا:

A Comparative Grammar of the Gaudian Languages with Special Reference to The Eastern Hindi. Accompanied by a Language Map and a Table of Alphabets.

گریرسن نے (Survey, Vol. I, Part I, page 27) اس کتاب کو ہرنل کا "شاہ کار" کہا ہے، لیکن اس نے Gaudian کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ بہر حال، ممکن ہے کہ "قاموس الاغلاط" کے مصنفین نے ہرنل کی دیکھا دیکھی مراٹھی کو "گوڑ" زبان کہہ دیا ہو۔ میں نے الٰہ آباد کے بعض سربرآوردہ ماہرین سنسکرت سے پوچھا تو وہ بھی "گوڑی" زبان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔

گریرسن نے "گوڑ" نام کی کسی زبان کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن اس کی فہرست (جلد اول، حصہ اول، ص ۴۵۰) پر "گولی" نام کی زبان درج ہے، اور لکھا ہے کہ یہ مراٹھی کی ایک شکل ہے اور ۱۹۱۱ کی مردم شماری کے قول کے مطابق یہ ضلع ناسک میں بولی جاتی تھی۔ چونکہ مراٹھی "ل"، انگریزی "L" اور اردو / ہندی "ڑ" کے بیچ کا سا سنائی دیتا ہے، اور خسرو نے فارسی میں "ڑ" کو "ر" ہی لکھا ہوگا، اس لیے قرین قیاس ہے کہ ان کی مراد مراٹھی ہی سے ہو۔ بنگال کے ضلع گوڑ کی کوئی زبان اگر ہو بھی تو غالباً اتنی اہم نہ رہی ہوگی کہ خسرو اپنی مختصر فہرست میں اس کا ذکر کرتے۔

ام و نظر بر نظیر نہ [باید] داشت، (۳) کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفے نہ دارد، مگر بضرورت۔ آں جا کہ ضرورت بودہ است، آوردہ شد۔ بیت:

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی
زمن ہندوی پرس تا نغز گویم

ذکر ترتیب سہ دیوان

پیش ازیں از پادشاہان سخن کسے را سہ دیوان نہ بود، مگر مرا، کہ خسرو ممالک کلام۔ مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست، اما ایں سہ دیوان در سہ عبارت است، عربی، و پارسی، و ہندوی۔ (۴)

(ترجمہ)

میں ہندوستانی ترک ہوں، ہندوی میں جواب دیتا ہوں، میرے پاس شکر مصری نہیں کہ زبان عرب میں گفتگو کروں۔

نظم ہندوی کے چند جزو نذر دوستاں کیے جا چکے ہیں۔ یہاں اس کے ذکر پر بس کرتا ہوں، اور مثال پر نگاہ نہیں رکھتا، کیوں کہ فارسی لطیف میں ہندوی الفاظ لانا چنداں لطف نہیں رکھتا، مگر بہ ضرورت۔ جہاں ضرورت تھی، وہاں لائے

---

(۳) کاش کہ خسرو نے کچھ نمونے دے دیے ہوتے۔ اس وقت تو ان کے ہندوی کلام کے بس چند مصرعے اور فقرے ہی دستیاب ہیں۔ میں نے خسرو کی اصل عبارت اس لیے نقل کر دی ہے تاکہ پڑھنے والے خود اطمینان کر لیں۔ خسرو نے ہندی / ہندوی میں بہت ہی کم کہا، اور جو کچھ کہا اس میں سے (چند متفرق عبارتوں کے سوا) اب کچھ ملتا نہیں۔

ملحوظ رہے کہ خسرو نے اپنی فہرست کی تمام زبانوں کو "ہندوی" کہا ہے۔ یعنی یہاں وہ ان زبانوں کا نام نہیں، بلکہ جائے پیدائش بتا رہے ہیں۔ یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ ان سبھی زبانوں کا نام "ہندوی" تھا۔ سنیتی کمار چٹرجی لکھتے ہیں: "دہلی اور اس کے اطراف میں جو زبان بولی جاتی تھی، اس کی نئی طرز، یا نئی شکل، جو ہندوستانی یا اردو کہلاتی تھی... وہ، اور شمالی ہند کی دوسری بہت سی انڈو آریائی بولیاں ایک مجموعی وجود کی حیثیت سے مغرب کے غیر ہندوستانیوں کے یہاں محض "ہندو" یا "ہندوستانی" (ہندوی، ہندوئی، یا ہندوی) کے نام سے جانی گئیں۔ اور یہ لفظ "ہندوستانی" (یا ہندوی، ہندی) بھی کسی مخصوص اصطلاحی مفہوم کا حامل نہ تھا۔" پروفیسر چٹرجی مزید کہتے ہیں کہ "ایک ڈھیلے ڈھالے نام کی اس غلط اور لاعلمی پر مبنی توسیع نے خاص کر گذشتہ پچاس برس میں، اور اس سے بھی زیادہ خاص طور پر ملک کی آزادی کے بعد کے پچیس تیس برسوں میں، اس خیال کو قائم کرنے میں مدد دی کہ "ہندی" کسی ایک ہی زبان کا نام تھا۔" (چٹرجی، ۱۹۷۳، ص ص ۳۶ تا ۳۷)۔

(۴) امیر خسرو: "دیباچہ غرۃ الکمال"، مرتبہ وزیر الحسن عابدی، لاہور، میشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۵، ص ص ۶۳ تا ۶۴۔

گئے:

میں، جو سچ پوچھو تو طوطی ہند ہوں
مجھ سے ہندوی کا پوچھو تو میں نغز گوئی کروں

تین دواوین کی ترتیب کا ذکر

اب سے پہلے، بادشاہان سخن میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے تین دیوان ہوں، سوا میرے، کہ خسرو ممالک کلام ہوں۔ مسعود سعد سلمان کے تین دیوان ہیں تو، لیکن وہ تین عبارتوں میں ہیں، عربی، اور فارسی، اور ہندوی۔

مندرجہ بالا سے دو باتیں ثابت ہو جاتی ہیں: مسعود سعد سلمان کا دیوان "ہندوی" میں تھا۔ (خسرو کے فحوائے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ دیوان دیکھا تھا۔) دوسری بات یہ کہ خسرو کا بھی کلام "ہندوی" میں تھا۔ خسرو نے اپنے اور مسعود سعد سلمان، دونوں کے کلام کے لیے لفظ "ہندوی" استعمال کیا ہے۔ دونوں کی زبان ایک ہی تھی۔ (خسرو کے بیان کردہ ناموں پر مفصل بحث اسی باب کے حاشیہ ۲ میں ملاحظہ ہو۔)

لیکن اب ایک اور سوال ہمارے سامنے آتا ہے: مسعود سعد سلمان لاہوری (۱۰۴۶ تا ۱۱۲۱) اور امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵) کے مابین پورے دو سو برس کا فصل ہے۔ اس مدت میں کیا ہوا؟ کیا وجہ ہے کہ ان دو صدیوں میں کچھ بھی ادب ہندوی میں نہ لکھا گیا؟ یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ مسعود سعد سلمان اور خسرو کا ہندوی کلام محفوظ کیوں نہ رہا؟ ان پر ہم ایک اور سوال کا اضافہ کر سکتے ہیں: خسرو کے بعد بھی ایک صدی کیوں گذری، اس کے پہلے کہ ہندوی میں ادب کی پیداوار شروع ہو؟ اس وقت کی اطلاع کے مطابق تو خسرو کے بعد اولین نام شیخ بہاء الدین باجن (۱۳۸۸ تا ۱۵۰۶) اور فخر دین نظامی (زمانہ: ۱۴۳۴) کے ہیں۔ شیخ باجن گجرات میں تھے، اور فخر دین نظامی خاص دکن میں۔

جہاں تک معاملہ امیر خسرو کے ہندوی کلام کے محفوظ نہ رہنے کا ہے، تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے ہندوی میں لکھا ہی بہت کم، اور جو لکھا اسے محفوظ کرنے کے سزاوار نہ سمجھا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے نظم ہندوی کے چند جزو، دوستوں کی نذر کیے ہیں۔ (۵) اگر ایک جزو آٹھ ورق کا مانا جائے، اور "چند

(۵) اس بیان کی روشنی میں دیکھیں تو خسرو کی بدیہہ گوئی کے جو قصے مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں لکھے ہیں، کچھ زیادہ قابل اعتبار ہو جاتے ہیں۔

جزو" سے مراد "پانچ / چھ جزو" سمجھی جائے، تو یہ کلام سو صفحے سے زیادہ کا نہیں بیٹھتا۔ اور اسے دوستوں کی نذر کر دینے کے معنی یہی ہیں کہ اگر یہ سب نہیں، تو زیادہ تر، ہنگامی اور تفریحی نوعیت کا کلام تھا، جسے انگریزی میں for the nonce کہتے ہیں۔ ایسے کلام کا محفوظ رہنا قرین امکان ہے بھی نہیں۔

شبلی نے اوحدی کرمانی کے تذکرے "عرفات العاشقین" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "برج بھاشا" میں خسرو کا کلام، ان کے فارسی کلام کے برابر ہے، اور فارسی کلام نظم و نثر کی مقدار انھوں نے چار سے پانچ لاکھ بیت (= چار سے پانچ لاکھ سطریں) بتائی ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ایک اور جگہ، شبلی نے اسی اوحدی کے حوالے سے "برج بھاشا" کی جگہ "ہندی" کا نام لیا ہے۔ (۶) ممکن ہے کہ شبلی، جنھوں نے بہت سی باتیں حافظے کے اعتماد پر لکھی ہیں، بھول کر "ہندی / ہندوی" کی جگہ "برج بھاشا" لکھ گئے ہوں، یا خود اوحدی کے ذہن میں ان زبانوں کا فرق واضح نہ ہو۔ یا پھر وہ "ہندی" کی اصطلاح سے کوئی بھی ہندوستانی زبان مراد لیتا ہو۔ (موخر الذکر صورت میں اغلب ہے کہ "ہندی" سے "دہلوی" ہی مراد ہے)۔ بظاہر تو اوحدی مبالغے سے کام لے رہا ہے، کیوں کہ یہ بالکل قرین قیاس نہیں کہ جو کلام چار پانچ لاکھ بیت پر مشتمل ہو، وہ سارے کا سارا یوں غائب ہو جائے کہ اس کا نشان ہی نہ رہے۔ اور ایسا بھی نہیں کہ خسرو نے ہندوی کے علاوہ کسی اور بھی ہندوستانی زبان میں لکھا ہو۔ (۶)

دوسری بات یہ کہ خسرو نے "دیباچۂ غرۃ الکمال" میں اپنے ہندی کلام کی کمیت کے بارے میں صرف "جزوے چند" کا فقرہ لکھا ہے۔ اور مثنوی "نہ سپہر"، جو "غرۃ الکمال" کے تقریباً پچیس برس بعد کی تصنیف ہے، اس میں خسرو نے یہ دعویٰ تو کیا ہے کہ وہ تھوڑی بہت سنسکرت جانتے ہیں، لیکن یہ نہیں کہا کہ وہ "ہندوی / ہندی" کے بھی شاعر ہیں۔ (۷) ان باتوں کے پیش نظر یہی کہنا پڑتا ہے کہ خسرو کا ہندوی کلام اس لیے باقی نہ رہا کہ وہ کچھ زیادہ کمیت کا نہ تھا، اور وہ زیادہ تر تفنن کے لیے، ہنگامی مواقع پر تصنیف ہوا تھا، اس لیے خسرو اسے چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔

رہا سوال کہ خسرو اپنے ہندوی کلام کو اہمیت کیوں نہ دیتے تھے، تو یقیناً اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے تک ہندوی کو ادبی اہمیت نہ حاصل نہ ہوئی تھی اور ادبی حلقوں میں وہ کچھ خاص توقیر، یا دلچسپی، کی حامل نہ تھی۔ خسرو اسے سرسری شعر گوئی سے زیادہ کے لائق غالباً نہ سمجھتے تھے۔ اور یہی سبب مسعود سعد سلمان کے ہندی دیوان کے ضائع ہو جانے کے لیے بھی بیان کیا جا سکتا ہے: ہندوی / ہندی کی اس زمانے میں کوئی

(۶) علامہ شبلی نعمانی: "شعر العجم"، جلد دوم، علی گڈھ، ۱۹۱۰، ص ص ۱۳۳، ۱۳۷ تا ۱۳۸۔

(۷) خسرو، "نہ سپہر"، ص ۱۸۱۔

ادبی حیثیت نہ تھی۔ اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ خود مسعود سعد سلمان کے ہندی / ہندوی دیوان کا حجم کتنا تھا۔ ممکن ہے وہ بس اتنا رہا ہو کہ اسے دیوان کا نام دیا جاسکے، یعنی تمام، یا زیادہ تر، ردیفوں میں دو دو چار چار غزلیں، یا شاید اس سے بھی کم۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فارسی گو حلقے، جو مسعود سعد سلمان کو فارسی کا بڑا شاعر گردانتے تھے، ان کی ہندی / ہندوی کو کچھ ذرا شرمندہ کن عجوبہ سمجھتے رہے ہوں۔ مشہور شاعر اور صوفی حکیم مجدالدین سنائی (۱۰۸۷/۹۱ تا ۱۱۴۵/۱۱۴۶) نے مسعود سعد سلمان کا کلام جمع کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ لیکن سنائی نے مسعود کی ہندی / ہندوی شاعری کا کوئی ذکر بظاہر نہیں کیا ہے۔ سنائی کے مرتب کردہ مجموعے میں کچھ ایسا کلام بھی شامل ہو گیا تھا جو مسعود سعد سلمان کے نام سے مشہور تھا لیکن ان کا تھا نہیں۔ اس پر مسعود سعد سلمان نے خفگی ظاہر کی تو سنائی نے اعتذار میں قطعہ لکھا۔ اس میں مسعود سعد سلمان کے ہندی کلام کا کچھ مذکور نہیں۔(۸)

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ مسعود سعد سلمان نے ہندی / ہندوی میں لکھا ہی کیوں، اگر ان کے زمانے میں اس زبان کی کوئی وقعت نہ تھی؟ اور یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ ہندی / ہندوی اس وقت تک، یا خسرو کے بھی وقت تک، ادبی زبان کیوں نہ بن چکی تھی؟ پہلے سوال کا جواب میرے خیال میں یہ ہے کہ مسعود سعد سلمان نے محض استادی اور قادر الکلامی کے مظاہرے کے لیے ہندی / ہندوی میں لکھا۔ شرق اوسط، اور ہندی + مسلم کے ازمنۂ وسطیٰ کے ادبی سماج میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ شعرا اپنی قدرت کلام کے اظہار کے لیے کئی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ یہ رسم ہمارے یہاں انشا اور ذوق تک باقی رہی۔ مسعود سعد سلمان نے عربی میں بھی اسی غرض سے لکھا ہو گا۔ دوسرا سوال، کہ چودھویں صدی کے آغاز تک بھی ہندی / ہندوی کو ادبی درجہ کیوں نہ مل سکا تھا، صوفیوں کے طریق عمل اور ان کی تعلیمات کے نفوذ سے وابستہ ہے۔ میں اس کی تفصیل آگے عرض کرتا ہوں۔

شیخ بہاء الدین باجن (۱۳۸۸ تا ۱۵۰۶) کو اردو کا پہلا باقاعدہ ادیب کہا جاسکتا ہے۔ شیخ کے دادا صاحب دہلی سے آکر احمد آباد، گجرات میں بس گئے تھے، اور شیخ باجن کی پیدائش وہیں کی ہے۔ انھوں نے مختلف مواقع پر اپنی زبان کو "ہندی"، "ہندوی" اور "گجری" بتایا ہے۔(۹) شمال کے لوگ، بالخصوص دہلی کا فوجی اور

(۸) Franklin Lewis: *Reading, Writing, and Recitation: Sa na'i and the Origins of The Persian Ghazal*, Unpublihed Ph.D. Dissertation, UMI Dissertation Services, Ann Arbor, Mich., 1996, pp. 130-137.

(۹) حافظ محمود شیرانی، "مقالات"، جلد اول، ص ص ۱۶۶ تا ۱۶۸۔ مزید دیکھیں: علی جواد زیدی:

(بقیہ اگلے صفحے پر)

عملہ اور فعلہ، بڑی تعداد میں گجرات اس وقت پہنچے جب علاء الدین خلجی (زمانۂ حکومت ۱۲۹۶ تا ۱۳۱۶) نے گجرات پر قبضہ کیا۔ اس سے بھی زیادہ تعداد میں لوگ غالباً اس وقت گجرات آئے جب تیمور نے دہلی کو تاراج کر کے اس پر اپنا تسلط قائم کیا (۱۳۹۸)۔ شیخ باجن کا زمانہ آتے آتے گجرات میں دہلوی بولنے والوں کی خاصی بڑی آبادی ہو گئی تھی۔ ان میں مقامی لوگ بھی رہے ہوں گے اور غیر مقامی بھی۔ دہلی سے دور ہونے کے باعث فارسی کا چلن یہاں اتنا نہ رہا ہو گا جتنا دہلی میں تھا۔ شیخ موصوف نے اپنے فارسی اور ہندوی کلام کا ایک مجموعہ اپنے پیر شیخ رحمت اللہ کے نام پر، "خزائن رحمت اللہ" (۱۰) کے نام سے مرتب کیا۔ اس مجموعے میں انھوں نے اپنی تصنیف کردہ ہندی / ہندوی جکریاں بھی شامل کیں۔ جکری اس زمانے میں شمال و جنوب کی معروف و مقبول صوفی صنف سخن تھی۔(۱۱) شیخ نے ساتویں "خزینے" کے عنوان میں فرمایا:

> خزینۂ ہفتم، ان اشعار کے ذکر میں، جو اس فقیر کے کہے ہوئے ہیں، اور جنھیں زبان ہندوی میں جکری کہتے ہیں۔ اور ہند کے قوال، انھیں سرود کے راگوں پر بجاتے اور گاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو پیر دستگیر کی مدح میں ہیں، بعض ان کے روضے کے وصف میں، اور بعض، اپنے وطن گجرات کی ثنا میں ہیں۔ اور بعض میں میرے اپنے مطالب کا تذکرہ ہے، اور مریدوں اور طالبوں کے مقصودات کا، اور بعض عشق و محبت [کے مضمون پر ہیں]۔(۱۲)

"خزائن رحمت اللہ" میں شیخ نے ایک عرصۂ طویل کے لیے اردو زبان اور ادب کے حدود اربعہ بیان کر دیے: اس کی زبان ہندوی ہے، اس کی بحریں ہندوستانی بھی ہیں اور فارسی بھی۔ اس کے مضامین

History of Urdu Literature مطبوعہ، نئی دہلی، ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۹۳، ص۔ ۴۷۔

ظہیر الدین مدنی: "سخن وران گجرات"، نئی دہلی، حکومت ہند، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱، ص ص ۵۰، ۶۵ تا ۶۸۔ گیان چند اور سیدہ جعفر: "تاریخ ادب اردو، ۱۷۰۰ تک"، جلد دوم، نئی دہلی، قومی کونسل برائے ترقی زبان اردو، ۱۹۹۸، ص ص ۲۰۴ تا ۲۱۱۔

(۱۰) ظہیر الدین مدنی ("سخن وران گجرات"، ص ص ۴۹ تا ۵۰) نے کتاب کا نام "خزانۂ رحمت" لکھا ہے، تو کہیں "خزانۂ رحمت اللہ"۔ انھوں نے جامع مسجد برہان پور میں محفوظ مخطوطے کا حوالہ دیا ہے۔ جمیل جالبی نے انجمن ترقی اردو کراچی میں محفوظ ایک اور نسخے کا حوالہ دیا ہے، انھوں نے "خزائن رحمت اللہ" لکھا ہے، اور وہی درست ہے۔ (جالبی، جلد اول، ص ص ۱۰۶ تا ۱۰۷)۔

(۱۱) شیرانی، جلد اول، ص ۱۷۶۔

(۱۲) بحوالہ جمیل جالبی، جلد اول، ص ۱۰۷۔ مزید دیکھیں: گیان چند اور سیدہ جعفر، جلد دوم، ص ص ۲۰۴ تا ۲۱۱۔

مذہبی / صوفیانہ بھی ہیں اور دنیاوی بھی۔ اس شاعری کی جڑیں عوام میں گہری ہیں، اور ہر دلعزیز بن جانے کی صفت اس میں پوری طرح موجود ہے۔ اس کے معاملات میں زہد روحانی اور صوفیانہ پاکیزگی نمایاں ہے۔ وطن کی محبت بھی اس کا ایک نمایاں وصف ہے۔

شیخ باجن کا کلام ناہموار ہے۔ بعض اوقات ان کا لہجہ وجد کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے، لیکن ان کا عام مزاج اخلاقی سبق آموزی کا ہے۔ مندرجہ ذیل نظم بیچ کی جگہ پر رکھی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دوری، اور وصول الی اللہ تقریباً ناممکن ہونا، اس مضمون کو ایک عجب مباہات کے ساتھ بیان کیا ہے، کہ ہمارا مطلوب اس قدر مشکل الحصول ہے! لیکن نظم میں ایک ہلکی سی بے چارگی اور مایوسی کا بھی شائبہ ہے۔ کامیابی یقینی نہیں، اور ناکامی کا امکان قوی ہے۔ ایسے محبوب کا چاہنے والا ہونے میں ایک طرح کا امتیاز بھی ہے:

تیرے پنتھ کوئی چل نہ سکے
چیری چلے سو چل چل تھکے — چیری=جو بھی
پڑھ پنڈت پوتھیں دھویاں
سبہ جانا سدھ بدھ کھویاں — سبہ=سب
سبہ جوگیوں جوگ بسارے
یہ تپیٔ تپ بکارے — تپیٔ=تپسوی؛ بکارے=بگاڑے
اک درشنی درشن بھولے — درشنی=فلسفی
سر ناگے پانو نہ کھولے — ناگے=ننگے؛ کھولے=کھلے
اک سیوری ہوئی کر سیو کرنہ — سیوری=جین
ہوئی کر=ہو کر؛ سیو=سیوا
ہوئے بر تپیٔ کیا دکھ دھر نہ — بر تپیٔ=مشکل تپیا کرنے والا
اک درویش ہوئی کر آئے
ہوئی قلندر روپ بھرائے
اک ابدال ہوئے ابد ہوئے — ابد=عابد
اک ہانڈھیں ہا ہا ہوئے — ہانڈھ=آوارہ گرد
ایک کھلے ہوئے دیوانے

اک باول ہندہ رانے — باول=باولا؛ ہندہ رانی=آوارگی
اک ماتے ہوئے اررادیں — اررانا=چیخنا چلانا
بہتی بے سدھ ہو ہو جاویں — بہتی=بہت ہی
اک جنگم جٹا دھاری — جنگم=جوگی
ہور بندہ نس اندھیاری — اندھیاری=سیاہ
اک کابری ہو ئی کر کنپہ — کابری=مجنون؛ کنپہ=کانپے
منڈھ سیویں تج ہی چنپہ — سیویں=منڈائے؛ تج ہی=تجھے ہی؛ چنپہ=جپتا ہے
ایک مند کنکل کل کرنہ — مند=چپکے؛ کنکل کل کرنہ=قابو میں لانا
اک پھونک پھونک باولے بھوئیں دھرنہ — دھرنہ=پکڑیں
ایک رہیں اپاسی راتنہ جاگنہ — اپاسی=روزہ دار
اک ہوئے بھکھاری تجھ بھی مانگنہ — بھکھاری=بھکاری [بھوک سے مرتا ہوا؟]

یوں ٹولی ٹولی ہو ئی کرے
سبہ رل رل گھل گھل کھوئی کرے — (۱۳) رل رل=مٹی میں مل کر؛ کھوئی=رس نکالا ہوا گنا

سادگی بیان، اور ایک طرح کی محویت اور خود سپردگی کے باعث یہ مناجات دل کو چھوتی ہے۔ لیکن اچانک ایک زبردست استعارہ (مطلوب حقیقی کے چاہنے والوں کا وہ حال ہو جاتا ہے جیسے عرق نکالا ہوا گنا) نظم کی سطح بہت بلند کر دیتا ہے۔ عشق حقیقی کے مارے ہوؤں میں نہ رس رہ جاتا ہے نہ جس، وہ گنے کے سوکھے ہوئے کھپچے کی طرح بس جلانے لائق رہ جاتے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ الفاظ اگرچہ عام طور پر سادہ ہیں، لیکن ان میں معنی کی فراوانی ہے۔ یہاں ایڈورڈ ٹیری کا قول یاد آتا ہے کہ "اندوستان" ایسی زبان ہے جو کم لفظوں میں بہت کہہ دیتی ہے۔ (۱۴) حالانکہ زبان نے ابھی استعاروں، پیکروں، اور محاوروں کا وہ

(۱۳) مدنی، "سخن وران گجرات"، ص ص ۶۶ تا ۶۷، اور شیرانی، جلد اول، ص ۱۶۹۔ متن دونوں ہی علما کا پوری طرح اطمینان بخش نہیں۔ مدنی کا متن بہتر ہے، لیکن مجھے کہیں کہیں قیاسی تصحیح کرنی پڑی ہے۔

(۱۴) باب اول ملاحظہ ہو۔

عظیم الشان بھنڈار حاصل نہیں کیا ہے جو آئندہ اس کی قسمت میں ہے، اور جس کی بنا پر اردو / فارسی شاعری دنیا میں عدیم النظیر ہے، لیکن پھر بھی شیخ کے یہاں کفایت الفاظ کا لطف موجود ہے۔

یہاں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حافظ محمود شیرانی کے یہاں اس نظم کا عنوان ہے "وایں مناجات بزبان ہندوی گفتہ شدہ است"۔ اور ظہیر الدین مدنی کے یہاں کوئی عنوان نہیں ہے۔ لیکن یہ، اور دوسری بہت سی نظمیں محض "گجری" عنوان کے تحت درج ہیں۔ یعنی یہ دونوں نام برابر سے مستعمل ہیں۔(۱۵)

ہندوستانی زبانوں میں صوفی روایت کی تقریباً تمام شاعری کی طرح شیخ باجن کی شاعری میں بھی اسلامی تصور کائنات کو ہندوستانی آئینے میں دیکھا گیا ہے۔ شروع کے صوفی شعرا کے یہاں ہندو پیکر، رسومیات، اور استعارے عام ہیں۔ بعض اوقات تو اس کا اثر ان کے نام پر بھی نظر آتا ہے۔ قاضی محمود دریائی (۱۴۱۹ تا ۱۵۳۴)، جو گجری / ہندوی کے دوسرے اہم شاعر ہیں، کبھی کبھی خود کو "محمود داس" لکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سنت کبیر (وفات ۱۵۱۸)، اور شیخ عبد القدوس گنگوہی (۱۴۵۵ تا ۱۵۳۸) نے اپنے نام "کبیر داس" اور "الکھ داس" اسی وجہ سے رکھے ہوں۔(۱۶)

انھیں بزرگوں سے کچھ ملتا جلتا معاملہ راجارام کا ہے۔ راجارام اور بنی پرشاد کے نام گجرات میں عرصہ دراز سے مشہور ہیں کہ وہ گجری کے شاعر تھے۔ ظہیر الدین مدنی کہتے ہیں کہ ایک روایت یہ بھی تھی کہ راجا رام نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک مدت تک انھیں خیال تھا کہ یہ دونوں نام محض افسانوی ہیں۔ لیکن ایک دن بالکل اتفاق سے انھیں راجارام کا دیوان مل گیا۔ یہ مخطوطہ اگرچہ ناقص ہے، لیکن اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ راجارام واقعی ایک شاعر کا نام تھا۔ مدنی کا خیال ہے کہ راجارام کا وطن سورت تھا، ان کا زمانہ سترہویں صدی کے ربع آخر کا معلوم ہوتا ہے، اور وہ غالباً اسلام لے آئے تھے۔ لیکن اس آخری بات کے بارے میں ثبوت صرف شاعری کا ہے، اور یہ دلیل دونوں طرف جا سکتی ہے۔ یعنی یا تو راجارام ہندو تھے، لیکن تمام اردو شعرا کی طرح وہ ایسے مضامین اور زبان استعمال کر رہے تھے جن پر اسلام کی چھاپ تھی۔ یا پھر وہ تھے مسلمان، لیکن انھوں نے ہندوانہ تخلص اختیار کیا، تاکہ اکثریت کے ساتھ اپنے دوستانہ اتحاد کا اظہار کریں، یا پھر اس لیے کہ ان کی نظر میں حقیقت الٰہیہ نام اور پتے سے ماورا تھی۔(۱۷)

(۱۵) شیرانی، جلد اول، ص ۱۶۹۔

(۱۶) جمیل جالبی، جلد اول، ص ۱۱۳۔

(۱۷) مدنی، "سخن وران گجرات"، ص ص ۹۳ تا ۹۶۔

پندرہویں صدی کے آغاز تک گجرات میں ہندوی کی مقبولیت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ اس کے الفاظ فارسی میں بھی در آنے لگے۔ چنانچہ فضل الدین محمد بن قوام بن رستم بلخی نے اپنا لغت "بحر الفضائل" تصنیف کیا (۱۴۳۳ / ۱۴۳۴) تو اس میں جگہ جگہ ہندی الفاظ درج کرنے کے علاوہ ایک باب الگ سے قائم کیا۔ اس میں وہ "الفاظ ہندوی" درج کیے جو "نظم میں بکار آتے ہیں"۔(۱۸)

قاضی محمود دریائی اور شیخ علی محمد جیو گام دھنی (وفات ۱۵۶۵) کا زمانہ آتے آتے اسم لسان کی حیثیت سے "ہندوی / ہندی" کی جگہ "گجری" کو بیش از بیش استعمال کیا جانے لگا۔ شیخ علی محمد جیو گام دھنی کے پوتے اور خلیفہ سید ابراہیم نے شیخ کے ہندوی کلام کے مجموعے "جواہر اسرار اللہ" کے دیباچے میں لکھا:

> شیخ العالم، میرے حضرت اور شیخ، نے حقیقت الحقائق اور معنی کے سمندر میں غواصی فرمائی، اور اپنے دل کو جواہر، اور مونگے، اور لولوے لالاے حقیقی سے بھر ڈالا۔ پھر ان کو رشتۂ شعر میں گوندھا، اس میں مکاشفات اور نکات بیان کیے۔ پھر ان کو اپنی گوہر یاب اور جواہر نثار زبان پر بطریق نظم لائے، اور الفاظ گوجری میں... جمع کیا اور انھیں "جواہر اسرار اللہ" نام دیا۔(۱۹)

"جواہر اسرار اللہ" میں "ہندی / ہندوی" بطور اسم لسان غالباً بالکل استعمال نہیں ہوا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ نام گجرات سے بالکل غائب ہی ہو گیا ہو۔ (یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا استعمال شروع سولہویں صدی میں گھٹ گیا ہو، اور بعد میں پھر کثرت سے رائج ہو گیا ہو)۔ چنانچہ "تاریخ غریبی" نام کی ایک مثنوی گجرات میں ۱۷۵۱ اور ۱۷۵۷ کے درمیان تصنیف ہوئی، اس میں یہ اشعار ملتے ہیں:

ہندی پر نہ مارو طعنہ
سبھی بتاویں ہندی معنی
یہ جو ہے قرآن خدا کا

(۱۸) شیرانی، جلد اول، ص ص ۱۰۲ تا ۱۳۱، ۱۶۱۔ لیکن حافظ صاحب مرحوم نے صفحہ ۱۱۵ پر عبارت ذرا مختلف لکھی ہے۔ یہاں درج ہے: "الفاظ ہندوی کہ در نظم بکار آید"۔ اس سے یہ بات نہیں صاف ہوتی کہ "نظم" سے مراد فارسی نظم ہے یا ہندوی۔ اغلب ہے کہ فارسی ہی مراد ہو گی، کیوں کہ لغت ہی فارسی کا ہے۔

(۱۹) شیرانی، جلد اول، ص ۱۸۱۔

ہندی کریں بیان سدا کا
لوگوں کو جب کھول بتاویں
ہندی میں کہہ کر سمجھاویں (۲۰)

جنوب کے اس خطے میں، جسے آج دکن کہا جاتا ہے، ہندی / ہندوی کی ادبی زندگی اگر اور پہلے نہیں تو پندرہویں صدی میں ضرور شروع ہو گئی ہو گی۔ اکا دکا اشعار اور اقوال کو چھوڑ کر پہلا کام جس سے ہم واقف ہیں، فخر دین نظامی کا ہے۔ ان کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کی تاریخ تصنیف ۱۴۲۱ تا ۱۴۳۴ قرار دی گئی ہے۔ ممکن ہے ۱۰۲۳ اشعر کی اس مثنوی کے پہلے بھی دکن میں کم و بیش طویل ادبی کارنامے سر انجام ہوئے ہوں۔ سیدہ جعفر کا کہنا ہے کہ خود مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں اس بات کے داخلی شواہد موجود ہیں۔(۲۱) یہ بہر حال حقیقت ہے کہ "کدم راؤ" کا واحد موجود نسخہ نا مکمل ہے، اور یہ مثنوی اور بھی زیادہ طویل رہی ہو گی۔

"کدم راؤ پدم راؤ" کی زبان مغلق اور کٹھن ہے۔ اس کے مقابلے میں شیخ باجن کا کلام زیادہ سہل الفہم محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظامی نے فارسی پر تکیہ کرنے کے بجائے تیلگو، کنڑ، کسی قدر مراٹھی، اور پھر سنسکرت کے تت سم الفاظ کو کثرت سے راہ دی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ شیخ باجن کے علی الرغم، جن کے یہاں فارسی اور ہندوستانی دونوں بحریں بکار آئی ہیں، "کدم راؤ پدم راؤ" میں فارسی کی متقارب مثمن محذوف (اکثر مقصور) نہایت صحت اور احتیاط کے ساتھ برتی گئی ہے۔ شاعرانہ مرتبے کے لحاظ سے نظامی کو شیخ باجن پر فوقیت نہیں، لیکن انھیں بیانیہ کا فن بخوبی آتا ہے۔ اس سے سیدہ جعفر کے خیال کو تقویت ملتی ہے، کیوں کہ ماقبل کے نمونوں کی غیر موجودگی میں کامیاب بیانیہ نظم کی تخلیق بہت مشکل ہے:

کدم راؤ آکھے زن دِئہ آ دھر؟	آکھے = کہے؛ دِئہ آدھر = ؟
کہ دھن بات سن بات یک چت دھر	دھن = بیگم؛ چت دھر = دل لگا کر
سنیا تھا کہ ناری دھرے بہت چھند	بہت = بروزن فع؛ چھند = فریب
سو میں آج دیٹھا ترے چھند بند	دیٹھا = دیکھا؛ بند = فند
وہی چھند جب میں دیٹھا جگ میں	
اسی ویل[تھے] ہوں پڑیا دگ میں	ویل = وقت؛ تھے = سے؛ دگ = حیرت

(۲۰) شیرانی، جلد دوم، ص ۲۴۹۔

(۲۱) گیان چند اور سیدہ جعفر، "تاریخ"، جلد دوم، ص ۱۴۔

سنیا تھا جو کن پر دیٹھا آج انک	کن = کان؛ انک = آنکھ
نہ راہا تھیں دیکھتے نین بنک؟	تھیں = اسی وقت؛ نین بنک = ؟
سجات ایک ناگن کجات ایک سانپ	
اسنگت دیٹھے کھیلتیں لانپ جھانپ	اسنگت = جن میں میل نہیں
جو کرتار مج کوں کیا ہوئے راؤ	
اسنگت کے کیوں دیکھ سکوں انیاؤ	انیاؤ = ظلم
کھڑک کاڑ دوکھا تہایا تکھار	کاڑ = نکال کر؛ دوکھا = دوڑایا
	تکھار = گھوڑا
اسی ٹھار کھورس کیا شب تہار؟	ٹھار = جگہ؛ کھورس = گھوڑا
	شب تہار = حملہ؟
گئی نہاس ناگن پران آپ لے	نہاس = تیزی سے
پران آپ لے کر گئی پونچ دے (۲۲)	پونچ = دم

مثنوی کا ایک ہی نسخہ دستیاب ہونے کے باعث قرأت کی مشکلیں حل نہیں ہو سکتیں۔ اگرچہ جمیل جالبی نے مخطوطے کی فوٹو کاپی بھی اپنے مدون کردہ متن کے ساتھ چھاپ دی ہے، اغلاط کے باعث اس کو پڑھنا آسان نہیں۔ پھر، بہت سے الفاظ کے معنی نہ کسی فرہنگ میں ہیں، اور نہ کسی لغت میں، حتیٰ کہ اردو لغت بورڈ کراچی کا ضخیم و جسیم "اردو لغت، تاریخی اصول پر"، بھی "کدم راؤ پدم راؤ" کے کئی الفاظ سے خالی ہے۔ مجموعی حیثیت سے "کدم راؤ پدم راؤ" ادبی سے زیادہ تاریخی دلچسپی کی حامل شاعری ہے۔ لیکن اس کے آہنگ میں ایک روانی ہے، جو نظم کو باآواز بلند پڑھے جانے کا تقاضا کرتی ہے۔

(۲۲) فخر دین نظامی: "کدم راؤ پدم راؤ"، مرتبہ جمیل جالبی، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۹ (۱۹۷۳)، ص ص ۹۱ تا ۹۳۔ مجھے ان اشعار کے حل کرنے میں پروفیسر مغنی تبسم سے بہت مدد ملی۔ پھر بھی اگر کوئی نقائص ہیں تو میرے ہیں۔